ڈاکٹر صائمہ ارم

لیکچرار شعبۂ اردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

جنوبی ایشیا کی سماجی تبدیلیاں اور ابتدائی اردو افسانہ

Dr.Saima Iram

Lecturer, Department of Urdu, GC University, Lahore

Social Changes in South Asia and Earlier Urdu Short Fiction

The social change in South Asia which began in the latter half of the19th century has left its imprint on every sphere of individual andcollective lives of its citizens. The era combined the colonialadministration in South Asia with the technological and intellectualinnovation which was taking place the world over. A strong agent ofsocial change was the colonial administration's attendant need to turnthe subcontinent into a region supplying agricultural produce to theBritish economy. It led to deep transformation of the society. Thepaper tries to look into the impact this phenomenon of social changehas made on the Urdu short fiction.

جس زمانے میں اردو افسانے نے جنم لیا وہ جنوبی ایشیا پر برطانوی راج کا زمانہ تھا۔ جنوبی ایشیا کے طول و عرض میں نوآبادیاتی نظام رائج ہو چکا تھا اور جہاں تہاں اس کا ردِعمل بھی سامنے آ رہا تھا۔ اس وقت کا ہندوستانی معاشرہ مغل دور کے معاشرے سے خاصا مختلف ہو چکا تھا اور جنوبی ایشیا کی سماجی تبدیلیاں اور ان کے مادی physical آثار زیادہ تر برطانوی راج کے مرہونِ منت تھے۔ یہ عمومی خیال کہ برطانوی راج سے پہلے کا ہندوستان زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھا بہرحال غلط ہے۔ یوں تو یہ امر واقعہ ہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد اس خطے میں تیز رفتار تبدیلیاں ہوئیں اور جنوبی ایشیا ظاہر اور باطن میں بہت بدل گیا لیکن انگریزوں سے پہلے بھی یہاں علوم و فنون خاصے ترقی یافتہ تھے اور یہاں کی حکومت خاصی خوشحال تھی۔ جنوبی ایشیا سے مشرقِ وسطیٰ، افریقہ اور مشرقِ بعید کی طرف سے ریشم اور کپاس کی تجارت نوآبادیاتی نظام سے پہلے رائج تھی اور جنوبی ایشیا کی اس تجارتی حیثیت نے مختلف ممالک کے تاجروں بشمول ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تجارت کے باوجود یہاں کی دولت کا زیادہ حصہ سونے، چاندی اور قیمتی پتھروں کی شکل میں جامد تھا جو یورپ کے نظامِ تجارت اور division of labour کے تصور سے متصادم تھا۔ انگریزوں کی آمد اور خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد کے منظرنامے کو سمجھنے کے لیے کارل مارکس کی رائے خاصی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ حمزہ علوی کارل مارکس کی رائے درج کرتے ہوئے بجا طور پر لکھتے ہیں

> Marx's view..... of the colonial regime was less benign. But as he

saw it, while colonialism had brought devastation and much suffering to Indian Society, it had also introduced capitalism into India and thereby a new dynamic of social transformation that, utimately, would be far more significant..."England", he wrote,"has to fulfil a double mission on India: one destructive and other regenrating__ The annihilation of the old Asiatic Society and Laying of the material foundations of Western Society in Asia."(1)

جنوبی ایشیا میں انگریزوں کی آمد کے بعد سماجی بدلاؤ کو سمجھنے کے لیے چند نکات کی وضاحت ضروری ہے۔ یورپ کا جاگیردارانہ نظام اپنے استحکام کے لیے زمین سے آمدنی حاصل کرتا تھا۔ جنوبی ایشیا پر تسلط کے بعد انگریزوں نے شروع میں یہاں بھی وہی نظام رائج کیا۔ جو علاقے انگریزوں کے زیر نگیں ہوجاتے وہاں سے لگان کی وصولی شروع ہوجاتی۔ لگان کا یہ نظام خاصا ظالمانہ تھا۔ اس میں کسان کی مالی مشکلات کو مدنظر نہیں رکھا جاتا تھا اور انگریز جنوبی ایشیا کی زراعت سے حاصل ہونے والی زیادہ تر آمدنی کو برطانیہ منتقل کر دیتے تھے۔ لگان اور اس سے حاصل شدہ آمدنی کی منتقلی سے دو طبقے بہت متاثر ہوئے۔ ایک جنوبی ایشیا کا دیہاتی طبقہ اور دوسرا وہ شہری طبقہ جو اس سے پہلے اپنی ضروریات دیہی سماج سے پوری کرتا تھا۔ یوں جنوبی ایشیا کلی طور پر اس نظام سے متاثر تھا اور اپنی ضروریات کے لیے انگریزوں کا محتاج ہو رہا تھا۔ یہ انگریز نوآبادیاتی حکومت کا پہلا دور تھا جسے مارکس نے Devestating کہا ہے۔ اسی عمل کا ایک ردعمل یہ بھی ہوا کہ جنوبی ایشیا کے پرانے شہروں کی آبادی تیزی سے گھٹنے لگی اور نئے شہر جو نوآبادیاتی ضروریات کو پورا کرتے تھے معرضِ وجود میں آنے لگے مثلاً ڈھاکہ کی آبادی ۱۵۰۰۰۰ سے گھٹ کر صرف ۳۰۰۰۰ رہ گئی اور ادھر لائل پور (موجودہ فیصل آباد) جیسے شہر وجود میں آئے جو انگریزوں کے تجارتی عزائم منصوبوں کے لیے مددگار ثابت ہوئے۔ جنوبی ایشیا کی colonial transformation کے پہلے دور میں یورپ کے صنعتی انقلاب نے بھی اس خطے کو خاصا متاثر کیا۔ خاص طور پر یہاں کی کاٹن انڈسٹری اس سے اثر پذیر ہوئی۔ صنعتی انقلاب سے پہلے تک یورپ کی مارکیٹوں میں انڈین کاٹن کی بڑی مانگ تھی۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مشین سے بنے کاٹن کی آمد کے بعد یہ مانگ کم ہوگئی حالانکہ اعداد و شمار کچھ اور صورتحال پیش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے تقریباً پچاس برس بعد ۱۸۱۳ء میں بھی یورپ میں انڈین کپڑے کی مانگ ختم تو کیا کم بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ مشین سے بنا ہوا کپڑا نفاست اور قیمت میں انڈین ٹیکسٹائل کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس صورتحال نے انگریزوں کو پریشان کیا اور انہوں نے جنوبی ایشیا کی تجارت کو نقصان پہنچانے کے دوسرے حربے اختیار کیے۔ مثلاً انڈین ٹیکسٹائل پر برآمدی ڈیوٹی میں ۸۵ فیصد کا اضافہ کر دیا گیا اور انڈین ٹیکسٹائل انڈسٹری کے زوال میں ٹیکسوں کے علاوہ بھی دو اور وجوہات تھیں۔ حمزہ علوی لکھتے ہیں

"First of all,in Britain itself, heavy protective duties were imposed to keep the very competitive and high quality, Indian Textiles out of the British market. The second factor was the closure of European ports during the Napoleonic Wars that sealed off the huge European

market for Indian textile..... a third factor, less visible, namely the effects which the colonial conquest and appropriation of land revenue by the colonial regime had on the internal economy and urban demand inIndia."(2)

نوآبادیاتی نظام کے زیر اثر سماجی بدلاؤ کا دوسرا دور انیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے۔اس دور میں انگریز حکمرانوں نے جنوبی ایشیا کے کم وبیش تمام رقبے پر اپنا تسلط جما لیا تھا اور قریب قریب سو برس کے ظالمانہ استحصال سے حاصل ہونے والی دولت نے انگلستان کی کاٹن کی صنعت کو استحکام بخش دیا تھا۔

ادھر ۱۸۶۰ میں امریکہ میں شروع ہونے والی خانہ جنگی کے باعث انگلستان میں خام کپاس کی شدید قلت ہوگئی۔انگریزوں نے خام کپاس اور غذائی اجناس کی فراہمی کے لیے شمالی ہندوستان کے میدانی علاقوں کو تیار کرنا شروع کیا۔انیسویں صدی کے وسط سے لگان کا نظام ختم کر دیا گیا اور انگریزوں نے یہاں کے کسانوں کو زراعت کی طرف مائل کیا۔ان کی کوشش تھی کہ یہاں سے خام مال حاصل کر کے یورپ کی منڈیوں اور فیکٹریوں میں بھیجا جائے اور پھر وہاں کا تیار شدہ مال دوبارہ برصغیر کے بازاروں میں بکنے کے لیے لایا جائے۔یوں برطانوی معیشت کو دوہرے فائدے کی امید تھی۔اس ضمن میں بنگال میں پٹ سن اور ریشم، پنجاب میں کاٹن اور سیلون (سری لنکا) میں چائے کے باغات کا پھیلاؤ بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔اپنے مقصد کے لیے انگریزوں نے برصغیر کی زراعت کو کمرشلائز (commercialize) کیا۔نوآبادیاتی حکومت نے فصل لگاؤ مہم شروع کر دی۔زراعت کے فروغ کے لیے نئے منصوبے بنائے گئے اور نئی سہولیات دی گئیں۔کھیتوں میں اچھی فصل اگانے کے لیے پانی کی مناسب اور مستقل فراہمی ایک لازمی امر تھا لہذا ایک وسیع نہری نظام تشکیل دیا گیا جو آج بھی مستعمل ہے۔اسی طرح جنوبی ایشیا کے دور دراز علاقوں سے فصل کی منتقلی کے لیے سڑکوں کا جال بچھایا گیا اور ریلوے کا نظام قائم کیا گیا۔اس نہری نظام کی دیکھ بھال کے لیے Irrigation کا محکمہ قائم ہوا۔اسی طرح سڑکیں بنانے اور ریلوے کو چلانے کے لیے بھی تربیت یافتہ افراد کی ضرورت تھی۔لہذا ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بنائے گئے جس کی ایک مثال موجودہ یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور (UET) ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو اردو سکھانے کے لیے اداروں کا قیام تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔اب نظام تعلیم کو برطانوی طرز پر تشکیل دینے کا عمل اور رجحان مزید بڑھ گیا۔لارڈ میکالے کی تعلیمی پالیسی سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انگریز جنوبی ایشیا کے نوجوانوں کو ایسی تعلیم دینا چاہتے تھے جس سے وہ یورپی اثرات کو زیادہ گہرے طور پر قبول کر سکیں۔اس پورے عمل میں بنیادی حیثیت زمین سے ہونے والی آمدنی کو حاصل تھی۔لہذا زمین کی ملکیت اور دوسرے مسائل کے حل کے لیے قانون سازی کی گئی۔بیوروکریسی کا عمل دخل مزید واضح اور مستحکم ہوا۔عدالتی نظام میں تبدیلیاں ہوئیں اور یوں آہستہ آہستہ جنوبی ایشیا برطانوی رنگ میں رنگتا چلا گیا۔اس پورے عمل کے دوران ایک اور اہم موڑ ''مڈل کلاس'' طبقے کا ظہور تھا۔نئے شعبوں کے قیام سے نئے پیشے وجود میں آنے لگے مثلاً کلرک، ٹیکنیشن، ڈاکٹر، ٹیکس ریکوری آفیسر، ٹیچر، چپڑاسی، چوکیدار وغیرہ، تو ان شعبوں سے روزگار کمانے کے خواہش مند افراد عموماً وہ ہوتے تھے جو زمین سے پیسہ کمانے کی بجائے اپنی تعلیم کے بل پر زندگی گزارنا چاہتے تھے یا ایسے لوگ جن کے پاس گزارے لائق زمین نہیں تھی اور وہ اپنے آبائی پیشوں کو چھوڑ کر نئے پیشے اپنا رہے تھے۔یوں حکمران اور کسان کے مابین ایک نیا طبقہ سامنے آنے لگا جسے مڈل کلاس کہا جا سکتا تھا۔نوآبادیاتی راج کے

آخری برسوں میں یہ مڈل کلاس مزید وسیع اور نمایاں ہوتی چلی گئی۔ یوں جنوبی ایشیا کے سماجی نظام میں طبقاتی تفاوت نے بھی جنم لیا۔ اس دور کے ہندوستان میں یوں تو ہر شہر اور ہر قصبہ ان تبدیلیوں سے متاثر تھا لیکن انیسویں صدی میں خاص طور پر کلکتہ، بمبئی اور بعد ازاں دہلی و لاہور اس انقلاب عظیم کی زد میں آئے۔

۱۶۵۵ء میں جاب چارناک (Job Charnok) نے ہگلی کے مشرقی کناروں پر ایک نئی بستی بسائی جسے کلکتہ کا نام دیا گیا۔ شمیم حنفی انیسویں صدی کے کلکتہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''ہگلی ندی کے کنارے، تیس میل کے طول میں بسا ہوا نگر، اسی لاکھ سے اوپر آبادی، جس کے جواب میں صرف ٹوکیو، لندن اور نیویارک کے نام لیے جا سکتے ہیں ...... کلکتہ تجارتی اور صنعتی اعتبار سے ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے اور شعور کی اجاگرتی کا سب سے بڑا مرکز......'' ۔۳۱

دہلی شہر مغلیہ سلطنت کے مٹتے ہوئے شکوہ کی آخری علامت تھا۔ انگریزوں نے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کلکتہ کو اپنی سلطنت کا پایہ تخت بنایا۔ یوں کلکتہ نئی تعلیم، نئے شعور، نئے طرز احساس اور نئے سماج کا نقش اولین بنا۔ ہندوستان کے دیگر شہروں کی بہ نسبت یہ اس قدر ترقی یافتہ تھا کہ غالب اپنے سفر کلکتہ کے دوران میں گویا ایک ''ونڈر لینڈ (Wonder Land) میں داخل ہو گئے۔ غالب ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اور یہاں ''بھاپ سے چلنے والے انجن، بغیر روغن کے روشن ہونے والے برقی چراغ، پرندوں کی صورت اڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جانے والے حرفوں کا طلسم اور زخمے کا سہارا لیے بغیر بجنے والا مشینی باجہ، غرضیکہ بھانت بھانت کی نادرہ کاریوں'' ۳۲ کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ اس سفر نے ان کے ذہن اور دماغ کو جلا بخشی اور دہلی واپس آنے پر وہ ہمیشہ کلکتہ کو یاد کرتے رہے۔ اسی سفر کا فیضان تھا کہ جب سرسید نے آئین اکبری کی تقریظ لکھنے کی درخواست کی تو انہوں نے اس وقت بھی انہیں صلاح دی کہ روشِ پارینہ ترک کی جائے اور نئی روشنی سے اپنی آنکھوں کو منور کیا جائے۔ کلکتہ میں صرف مادی ترقی ہی نہیں تھی۔ یہ شہر صرف سائنسی ایجادات کی وجہ ہی سے عظیم نہ تھا۔ یہاں کا منظر نامہ صرف انگریزوں کی تعمیر کردہ نئے انداز کی عمارتوں ہی سے تبدیل نہیں ہوا تھا بلکہ کلکتہ کے دل میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ یہاں شعر و شاعری کا چرچا عام تھا۔ علم کی شمع روشن تھی۔ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، ہندو کالج، مدرسہ عالیہ اور فورٹ ولیم جیسے ادارے تھے۔ بنگال ہرکارو، کلکتہ ریویو، ہندو پیٹریاٹ، فرینڈس آف انڈیا، عوامی شعور کو انقلاب اور آزادی فکر کی تربیت دے رہے تھے۔ کلکتہ ہندوستان کی ان بستیوں میں سے تھا جن کے لیے لفظ شہر کا استعمال صحیح معنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ کلکتہ تضادات کا شہر تھا۔ ایک طرف اونچی، وسیع اور جدید طرز تعمیر کی انگریزی عمارتیں تھیں تو دوسری طرف بھوک سے مرتے ہوئے انسان بھی تھے۔ کلکتہ کی ایک لفظی تصویر دیکھئے۔

> ''کلکتہ: خوف اور دہشت اور اندھیرے اور اتینجنا کا شہر، فضا کی بلندیوں سے نیچے دیکھو تو دور دور تک ہریالی دکھائی دیتی ہے۔ کہیں گہری، سیاہی مائل، کہیں پیلاہٹ لیے ہوئے لیکن ...... ایک ان دیکھی توانائی کا استعارہ ہے ...... کتے کے پیر جیسی ہیئت رکھنے والی چوڑی بھوری ندی کے گرد بسا ہوا شہر، ساحلوں پر لنگر انداز دخانی کشتیاں اور جہاز، قوی الجثہ کرینیں، ملوں کی چمنیاں اور کارخانوں کی زنگ آلود آہنی چھتیں، پھر ذرا اور نیچے آنے پر تاڑ کے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف اس جھنڈ سے ابھرتا ہوا برٹش راج کی یادوں میں بسے ہوئے پرانے کلیسا کا سفید دم بخود مینار اور دوسری

طرف بیل گاڑی پر بھاری بوجھ لادے، بیلوں کو ٹھونگے لگاتا، کالی کتھئی جلد والا مزدور ..... یہ انتہاؤں کا شہر ہے''۔۵

انگریز تمدن اور صنعتی انقلاب کو سب سے پہلے کلکتہ ہی نے جذب کیا اور بغاوت کی چنگاریاں بھی سب سے پہلے یہیں سے پھوٹیں۔ ۱۸۵۷ء میں لارڈ کیننگ نے بنگالی اخبارات پر برٹش راج کے خلاف نفرت اور غصہ پھیلانے کا الزام لگایا اور کئی بنگالی اخبارات پر پابندی لگادی گئی۔ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) اور پھر اس کی تنسیخ، سودیشی تحریک، تشدد کی لہر، انقلاب عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ ۰۶۔۱۹۰۵ء میں پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر بنگالی عوام نے اپنی حالت زار پر شدید ناخوشی اور برٹش راج پر عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ یہ ایسا مظہر تھا کہ برطانوی حکومت کو ہندوستان میں اپنے اقتدار کے مضبوط ستون ہلتے ہوئے محسوس ہوئے اور مزید کسی خرابی سے بچنے کے لیے ۱۹۱۱ء میں، امپیریل کونسل میں، وائسرائے کے ہوم ممبر جان جنکسن کے مشورے سے دسمبر ۱۹۱۱ء میں تخت شاہی کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان ہوا۔ عدم اطمینان کی یہ لہر پورے ہندوستان میں پھیلتی چلی گئی اور بالآخر انگریز حکمرانوں کو واپسی کا وہ سفر اختیار کرنا پڑا جس کا اعلان بنگال میں ہو چکا تھا۔ تو گویا کلکتہ کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ

''کلکتہ، ہندوستان کی تہذیبی نشاۃ الثانیہ کا نقش اولین، ہندوستان کے سماجی، تعلیمی اور روحانی سفر کی ایک نئی راہ کا پہلا سنگ میل اور آج ایک نئے عقیدے، ایک نئے اجتماعی خواب، ایک نئے ذہنی اور جذباتی ردعمل، ایک نئے طرز احساس اور ایک نئے ایقان کا اشاریہ.....''۶

نئے شعور اور نئے تمدن کا دوسرا بڑا مظہر ہمیں بمبئی میں نظر آتا ہے۔

"On the Map of Mumbai Metropolitan Region Issued by the Region's Development Authority, the Land beyond the eastern boundary is marked as the West coast of India ..... It was not until the late mineteenth century that Bombay started thinking of itself as an Indian City. And even now there are people who would prefer it if Bombay were a city state, like Singapore"۷

بمبئی ہندوستان کے لیے ساحلی تجارتی گزرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی بانہیں ہر ایک کے لیے اس وقت تک کھلی تھیں جب تک کہ وہ تجارت کرنا چاہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جیرالڈ آنگیر (Gerald Aungier) (۱۶۷۵ء۔۱۶۷۲ء) نے بمبئی کو پرتگالی جاگیردارانہ اور مذہبی پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ جس سے بمبئی ایک فری پورٹ (Free Port) کے طور پر ابھرا اور اس کی حیثیت ہندوستان کے لیے داخلی دروازے کی سی ہوگئی۔

امریکی سول وار کی وجہ سے جب انگلستان کو کاٹن کی ترسیل رک گئی تو بمبئی نے اس موقع پر اپنی حیثیت کو منوایا اور ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء کے پانچ سالہ عرصے میں اسی ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ کا منافع کمایا۔ ۱۸۶۹ء میں سوئز کنال (Suez Canal) کے کھلنے سے بمبئی کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ بمبئی ہندوستان کا امیر ترین شہر بن گیا۔

بمبئی، آبادی کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے گنجان آباد ترین شہروں میں سرفہرست تھا۔شہری تمدن کے تمام مظاہر پوری تب وتاب کے ساتھ اس شہر میں نظر آتے تھے۔ یہ تجارت کا مرکز تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں شخصی اور انفرادی آزادی کا بھی دور دورہ تھا۔طبقاتی تفریق یہاں بھی نمایاں تھی۔بمبئی کا ایک منظر نامہ دیکھیے۔

"Villages in the city, the visual shock of Bombay is the shock of this juxta position ..... the continuous dim of the traffic, the stench of bombil fish drying on stilts in the open air, the inescapable humid touch of many brown bodies in the street, the searing heat of the garlic "Chuteny" ..... The sea on all sides the palm trees, creeks, rivers, hills, from the air, you get a sense of its possibilities" ۸

کلکتہ اور بمبئی کے ساتھ دہلی ہندوستان کا تیسرا بڑا اور اہم شہر تھا۔شہر دہلی کئی بار اجڑا اور کئی بار بسایا گیا۔ یہ مغلیہ شان وشوکت اور سطوت پارینہ کا نشان تھا۔انگریز اگرچہ ہندوستان کے طول وعرض میں اپنا اقتدار مستحکم کرتے چلے گئے لیکن ۱۸۵۷ء تک انہوں نے دہلی کا منظر نامہ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔انہوں نے کلکتہ کو حکومت اور بمبئی کو تجارت کا مرکز بنایا۔یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے کلکتہ اور بمبئی پر یورپی سوچ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جبکہ دہلی ۱۸۵۷ء تک مغلیہ اور روایتی طرز احساس کا اسیر محسوس ہوتا ہے۔دہلی کی تاریخ میں انیسویں صدی کی بہت اہمیت ہے۔۱۸۵۷ء سے پہلے کا دہلی، ۱۸۵۷ء کے بعد کے دہلی سے یکسر مختلف ہے۔ نہ صرف باطن بلکہ ظاہر میں بھی۔ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں سے دہلی کو واپس لے لیا لیکن یہاں اپنا اقتدار جمانے کی بجائے اسے مغل شہزادوں کے حوالے کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت تک دہلی، مغلیہ خاندان کے لیے پایہ تخت رہا اور کلکتہ اور بمبئی کے برعکس دہلی، شہر سے زیادہ "A collection of many villages" ۹ محسوس ہوتا تھا۔لیکن ۱۸۴۴ء تک یہ شہر اتنا بدل گیا کہ ایک یورپی فوجی نے جو کلکتہ سے دہلی آیا تھا اس شہر کے لیے "The largest city in India" ۱۰ کا جملہ استعمال کیا۔۱۸۳۳ء کی مردم شماری کے مطابق، محل کے علاوہ دہلی کی آبادی ۱۱۹،۸۶۰ افراد پر مشتمل تھی۔۱۸۳۳ء، ۱۸۴۵ء اور ۱۸۴۳ء کی مردم شماری کے مطابق دہلی کی آبادی ۱۳۱،۰۰۰، ۱۳۷،۰۰۰ تک رہی جبکہ ۱۸۵۴ء میں یہ آبادی ۱۵۱۰۰۰ افراد تک پہنچ گئی۔

"An Indian chronicler, writing in the early nineteenth century, who remarked on the extent of Calcutta, the buildings of Jaipur, the abundance of goods in Lucknow, thought that Dehli was chiefly remarkable for its aadmiyat, its polished urbanity. And the culture of Dehli was contained within its walls. Th culture ..... was ..... narrow - mindedly urban, seeking protection within the city walls against a surrounding barbarism ۱۱

یہ شہر پھول والوں کی سیر، بسنت اور مشاعروں کا شہر تھا۔ ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور روایتی طرز احساس میں رچا بسا تھا۔ اگرچہ جدید روشنی کی کرنیں یہاں تک پہنچنا شروع ہوگئی تھیں۔ دہلی میں چھاپہ خانوں کا قیام اس کی ایک مثال ہے۔

دہلی کی نشاۃ الثانیہ میں جن اداروں کا اہم کردار رہا ہے۔ ان میں دہلی کالج سرفہرست ہے۔ اس کالج نے کئی نامور ہستیوں کو اپنے دامن میں سمویا اور دہلی کے باشندوں کی ذہنی اور تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں دہلی پر حکمرانی کرنے کا برطانوی خواب پورا ہوا اور اسی کے ساتھ عظیم مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ انگریزوں نے دہلی پر بھی قبضہ جما لیا اور یہاں سے دہلی کا ایک نیا روپ ابھرنا شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کے چند برس اہل دہلی پر بہت بھاری گزرے۔ خصوصاً مسلمانِ نان شبینہ محتاج ہوگئے۔ ان کی حب الوطنی شدید شبہات کی زد میں آگئی اور اگرچہ جنگ آزادی میں ہندو بھی شامل تھے مگر انگریزوں کے عتاب کا نشانہ صرف مسلمان بنے۔ شہری اپنی ہی دیواروں میں محصور ہو کر رہ گیا۔ دہلی کے باشندے اپنے آبائی مسکن سے ہجرت پر مجبور ہوگئے اور تباہی و ویرانی ایک دفعہ پھر دہلی شہر کا مقدر ٹھہری۔ لیکن جس طرح ہر ''کمالِ راز وال'' کا مقولہ درست ہے اسی طرح ہر زوال کے بعد عروج کا مرحلہ بھی آتا ہے۔ دہلی شہر ایک دفعہ پھر آباد ہوا اگرچہ انگریزوں نے شہر کے پرانے طرزِ تعمیر اور طرزِ انتظام کو زیادہ تبدیل نہیں کیا پھر بھی اس دفعہ یہ شہر ایک نیا شہر تھا۔ جس میں پرانی ثقافت اور روایات کی بو باس کے ساتھ ساتھ چپے چپے پر نئی تعمیر اور ترقی کے اثرات موجود تھے۔ ۱۸۹۰ء میں شہر کو تجارتی مرکز (Commercial Capital) کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

۱۸۷۷ء کے قحط کے باوجود دہلی شہر خوشحالی کی طرف گامزن رہا۔ تجارت، یہاں کے باشندوں کا مطمع نظر ٹھہری۔ شہریوں کا طرز حیات جدید تر ہوا۔ نکاسیٔ آب اور بہم رسانی آب دونوں کے طریقے تبدیل ہوئے۔ پرانے کنوؤں کی جگہ مرکزی نہر نے لی اور پھر نہر سے بھی آگے گھر گھر پانی کی پائپ لائن بچھنی شروع ہوئی۔ ۱۸۸۷ء تک دہلی کی حکومت، اپنے شہر کی ترقی و خوشحالی پر لاہور اور امرتسر سے زیادہ خرچ کر رہی تھی۔ یہ تو دہلی کا بیرونی منظر نامہ تھا۔ شہر کے لوگ، نئی روشنی سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ نچلے طبقے کے لوگ بھی نہ صرف اپنے حقوق سے آگاہ تھے بلکہ ان کے تحفظ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اس سلسلے میں نارائنی گپتا (Narayani Gupta) لکھتے ہیں۔

> The "mohulla" sweepers went on strike again in 1889 ..... What gave the sweepers confidence this time was the fact that there were no bye-law under which they could be punished, and as education (was) becoming more general and lawyers were plentiful, they were aware of this"۱۲

صحت و صفائی کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ ویکسینیشن لازمی تھی۔ اگرچہ دہلی کے باشندے اس کو پوری طرح قبول کرنے میں شدید ہچکچاہٹ کا شکار نظر آتے تھے لیکن تبدیلی کے آثار بھی نمایاں تھے۔ دہلی کے لیے ایک اور اہم تبدیلی ریل کی آمد تھی۔ یوں تو اٹھارھویں صدی کے نصف آخر (۱۸۶۰ء) ہی سے ریل اہلیان دہلی کے لیے عجوبہ نہیں رہی تھی لیکن بجلی کی آمد کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں شہر میں ٹرام کا نظام رائج ہوا جس نے شہر کو بالکل نئی شکل دی۔ اسی دوران میں دہلی کی آبادی اس قدر بڑھ گئی کہ فصیل شہر کو اکثر و بیشتر گرا دیا گیا اور اگر کہیں اسے باقی رہنے بھی دیا گیا تو اس کی حیثیت آثار قدیمہ سے زیادہ نہ رہی۔ اب دہلی شہر تعلیم، صحت، فنون لطیفہ اور تجارت سمیت ہر پہلو میں دوسرے شہروں کا

مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔

متحدہ ہندوستان کے اہم ترین شہروں میں لاہور اور امرتسر کا نام بھی شامل ہے۔ جس زمانے میں ہندوستان تقریباً برطانوی راج کے زیر نگیں تھا۔ لاہور پر رنجیت سنگھ کا قبضہ تھا اور یہ سکھ راج لاہور تا پشاور و کشمیر پھیلا ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف تک، انگریز سکھ راج کو ختم نہیں کر سکے۔ اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اس کے جانشینوں کی نااتفاقی، باہمی کشاکش اور بعض حالات میں قدرتی اموات نے، انگریزوں کے اقتدار کی راہ بہت حد تک آسان بنا دی۔

امرتسر جس کے معنی "Tank of nectar" کے ہیں۔ ۱۵۷۴ء کو وجود میں آیا۔ جب گرو رام داس نے یہاں قیام اختیار کیا۔ سترھویں صدی تک اسے رام داس پور ہی کہا جاتا تھا۔ سکھ راج (۱۸۴۹ء۔ ۱۷۹۸ء) کے دوران میں امرتسر کی معاشی، سماجی مذہبی اور تہذیبی نشوونما عروج پر پہنچی۔ ۱۸۲۰ء میں فصیل شہر تعمیر کی گئی۔ اس عرصے میں امرتسر، پنجاب کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بن گیا تھا خصوصاً ریشم اور شال سازی کی صنعتیں تیزی سے ترقی پا رہی تھیں۔ تجارتی روابط، وسطی ایشیا تک قائم کیے جا چکے تھے۔ شہر کی رونق و خوشحالی کا اندازہ جرمن سیاح برون چارلس ہیوگل (Baron Charles Hugel) کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ۱۸۳۶ء میں امرتسر کی سیر کے دوران میں امرتسر کو "The most hustling all of the Punjab cities" [۱۳] کہا۔ امرتسر کی یہ حیثیت برطانوی راج کے زیر سایہ بھی قائم رہی۔ بلکہ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے واقعے کی وجہ سے امرتسر کو برطانوی راج کے خلاف جدوجہد میں قومی سطح پر نمایاں اہمیت حاصل ہو گئی۔ انگریزوں نے جب لاہور اور امرتسر پر قبضہ مکمل کیا تو ان دونوں شہروں میں بھی انگریزوں کی آمد کے آثار نظر آنا شروع ہوئے۔

> "Under British rule, the two cities acquired the typical colonial urban developments of civil lines, with their tree-lined roads and spacious bunglow, cantonments and a Mall Road thoroughfare ..... Lahore was not only the administrative capital but also became the headquarters of the North- Western Railway, of the third or lahore Division of the Northen command .... Lahore was also the leading educational centre of the north India" [۱۴]

دہلی، کلکتہ اور بمبئی کی نسبت لاہور، قدرے تاخیر سے برطانوی راج کے زیر اثر آیا لیکن یہاں کی فضا نے اس اثر کو اس قدر تیزی سے قبول کیا کہ انیسویں صدی کے اواخر تک خود اربابِ اقتدار بھی اس حد تک اس شہر کی ترقی و ترویج کی طرف متوجہ اور کوشاں ہو چکے تھے کہ دوسرے علاقوں میں عموماً اور دہلی میں خصوصاً یہ تاثر پھیلنا شروع ہوا کہ لاہور کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ثقافت اور علم کا گہوارہ تھا اور گزرتے وقت نے اس کی اہمیت کو دوچند کیا۔

> "Lahore's larger student and European populations lent it a more cosmopolitan feel ... The city was the "Paris of the East". It .... possessed a ... cafe society of students, poets, academics, and

writers. ... It boasted the modern movie entertainment in the Bhati Gate and Mcload Road cinemas which not only showed the latest Hollywood epics but also Punjabi and Hindi films produced in Lahore's Shorey Film Studios" ۱۵

مغلیہ ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار نے اس خطے کی سیاسی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی زندگی پر انمٹ نقوش ثبت کیے۔ ظاہری سطح پر تو نئے حکمرانوں کی قبولیت کا عمل بہت نمایاں اور تیزی سے ہوتا ہوا نظر آیا۔ نئے مدرسے، نئی ایجادات، نئی سوچ، نئی تعمیرات وغیرہ پر برطانوی اثرات تھے لیکن لوگوں کی نفسیات بدلنے میں خاصا وقت صرف ہوا۔

لوگوں کی اکثریت اپنی روایات کی پاسداری کے لیے خاصی جذباتی تھی اور نئے حاکموں کے اکثر اقدامات کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس وقت تک ان کو قبول نہیں کرتی تھی جس وقت تک ان کے اپنے لوگوں میں سے بالائی طبقہ ان اقدامات کی پیروی نہیں کرتا تھا۔ اس کی ایک مثال دہلی میں ویکسینیشن کا آغاز ہے۔ عوام الناس کو ویکسینی شن (Vaccination) کی اہمیت وافادیت سے روشناس کرانے اور اس حفاظتی قدم کی طرف مائل کرنے کے لیے برطانوی حکومت کو، برصغیر میں اعلیٰ طبقے کے نمائندہ افراد کو چننا پڑا۔ جب اہل ہند میں سے سید، شیخ، پٹھان اور برہمن افراد نے ویکسینیشن کو خوش آمدید کہا تو باقی ماندہ طبقوں کے لیے بھی اسے قبول کرنا آسان تر ہوتا چلا گیا۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں۔

> ''.....تم ذرا اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ کرو۔ حکومت ان کے ہاتھ سے چھن گئی۔ محض کچھ عرصہ قبل تک برطانوی سفیر کو مغل شہنشاہ کے دربار میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اسے کرسی نہیں ملتی تھی اور اب ۱۸۵۷ء کے بعد اس ضلع کے ایک معمولی انگریز حاکم کے سامنے اپنے جوتے اتار کر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ تمہارے ان بزرگوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہو گی۔''۱۶

انگریزوں نے جس مغلیہ ہندوستان سے حکومت چھینی وہ ایک لحاظ سے بہت ترقی یافتہ تھا اور اس کی تہذیب وثقافت اپنا ایک خاص مقام رکھتی تھی۔ اس کے دسترخوان مشہور تھے اور فن تعمیر و دیگر ہنروری میں اس کا جواب نہ تھا۔ اس وقت کا لکھنؤ اپنی نفاست میں کسی طرح بھی اٹھارھویں صدی کے فرانس سے کم نہ تھا اور یہ شائستگی عوام وخواص میں یکساں طور پر نفوذ تھی۔ انگریزوں کی آمد کے بعد یہاں دو طرح کے طبقہ فکر کا پیدا ہونا محال یا عجیب نہیں تھا۔ ایک طبقہ وہ تھا جو ہر حال میں اپنے ماضی کے شکوہ کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرا طبقہ، نئی روشنی کی کرنوں سے اپنے دماغ کو روشن کرنے کے لیے بھی تیار تھا۔ یہ طبقہ زیادہ تر نوجوانوں پر مشتمل تھا اور نوجوان بھی وہ جو نئی تعلیم اور نئی سوچ سے بہرہ ور تھے۔ انیسویں صدی کے اواخر سے بیسویں صدی کے اوائل تک کا عرصہ گویا اہل ہند کے لیے ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں اگر ایک طرف علی گڑھ تحریک ہے اور نئے انداز کی شاعری ونثر کا چرچا ہے تو دوسری طرف ایسے شعراء ہیں جو غزل کے روایتی اسالیب میں اپنے جذبات کے اظہار کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ جنوبی ایشیا کی سماجی وسیاسی یہاں تک کہ علمی تبدیلیاں بھی انگریزوں کے اپنے مفاد میں تھیں لیکن ان کا بالواسطہ فائدہ یہاں کے باسیوں کو بھی پہنچا۔ نوجوان ذہن جدید تعلیم سے بہرہ ور

ہوئے اور نئی روشنی نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہی جدید شعور ہی تھا کہ جو منظم تحریک آزادی کی وجہ بنا۔ ہندوستان کے سیاسی نظام میں اتھل پتھل کے ذمہ دار افراد زیادہ تر یورپی تعلیم سے روشناس تھے۔ ادھر ادب میں بھی ایسے افراد کا کردار بہت نمایاں ہے جو جدید تعلیم کے پروردہ تھے۔ انھی تبدیلیوں نے یہاں کے لوگوں کو جرأت اظہار بخشی اور یہی تبدیلیاں بالآخر نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی وجہ بنیں۔ افسانے کے اولین معمار بھی نئی روشنی سے اپنے دل و دماغ کو منور کر چکے تھے۔

اردو افسانے کا آغاز، بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ اگرچہ انیسویں صدی کے اواخر ہی سے افسانہ نما نثر پارے منظر عام پر آنے لگے۔ لیکن افسانے کے پیش رو اور فنی و موضوعاتی لحاظ سے مکمل پختہ افسانے بیسویں صدی کے شروع میں سامنے آئے۔ افسانہ نگاری میں اولیت کا سہرا عموماً پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے سر باندھا جاتا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم کے زیادہ تر افسانے ترکی ادب سے ماخوذ یا ترجمہ شدہ ہیں جبکہ پریم چند کے ہاں طبع زاد افسانوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ پریم چند کے افسانوں کے فنی پہلو سے قطع نظر، ان کے بیشتر ناقدین نے، موضوعاتی جائزوں کے ذریعے انہیں دیہات کا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ اس امر میں شبہ نہیں کہ گاؤں اور گاؤں کے باسیوں کی زندگی آب و تاب کے ساتھ ان کے افسانوں میں جلوہ فگن ہے لیکن ان کے افسانوں کا بغور جائزہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ پریم چند، دورِ جدید کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بے خبر نہیں تھے۔ وہ گرد و پیش کے حساس شاہد تھے اور ان کی نگاہ دور بین سے، انسانی زندگی کا تنوع پوشیدہ نہیں تھا۔ بیسویں صدی کی ہنگامہ خیز ترقی نے برصغیر میں بھی شہری زندگی کی داغ بیل ڈال دی تھی اور دیہاتوں کے منظر نامے بدلنے لگے تھے۔ انسانی رویوں اور نفسیاتی جہتوں میں تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ دولت کی افراط اور طبقاتی تفاوت امتیاز پانے لگا تھا۔ دفتری اور سرکاری امور کی انجام دہی میں فرق آنے لگا تھا۔ تکلفات و آرائش کی طرف دھیان دیا جاتا تھا۔ نت نئی سائنسی ایجادات اور نئے آلات، ذرائع رسل و نقل و حمل کے نئے طریقے رواج پانے لگے تھے۔ یہاں تک کہ تفریح کے انداز بھی بدلنے لگے تھے۔ پریم چند ان تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھے ان کے افسانوں میں بھی ہمیں جا بجا بدلتے ہوئے معاشرے کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ سیاسی تحریکیں، سیاسی قیدی، جلسے جلوس سے لے کر دفتری نظام، شہریوں کے مختلف پیشے، طبقاتی امتیازات، کھیلوں کے نئے انداز، نئی تعلیم اور اس کے اثرات، معاشرتی رہن سہن کی تبدیلیاں، انفرادی اور اجتماعی سوچ کی بدلتی ہوئی نفسیاتی جہت، کمزور طبقے کی پریشانیاں، مالی بدحالی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی الجھنوں سے لے کر روزگار کے نئے مواقع، نئی نسل کی روشن خیالی اور خصوصاً عورتوں کے نئے شعور کی بیداری تک شہری زندگی کے کتنے ہی ایسے پہلو ہیں جو ان کے مختلف افسانوں کے موضوع بنے۔ ''یہی میرا وطن ہے'' میں پریم چند ایک غریب الدیار کی وطن واپسی کا ذکر کرتے ہیں اور ایک طویل عرصے کے بعد جب وہ اپنے وطن کی محبت سے بے تاب ہو کر اسی سرزمین کی طرف لوٹتا ہے جس کی آغوش میں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا تو اس کے ساتھ ساتھ، قاری کو بھی سرزمین ہند میں آ جانے والی تبدیلیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ یہ وہ تبدیلیاں ہیں جو گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہوئیں اور ان کا حصہ بنے رہنے کی وجہ سے ہمیں احساس تک نہیں ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسے بچہ، والدین کے سامنے آہستہ آہستہ بڑا ہوتا چلا جاتا ہے اور انہیں کسی روز اچانک احساس ہوتا ہے کہ ان کا معصوم بچہ، جوان کی انگلی تھامے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتا تھا، ان کے سہارے سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیا بسا چکا ہے۔ کچھ اسی طرح کا احساس برس ہا برس بعد اس تارک وطن کو واپس لوٹنے پر ہوتا ہے اور قدم قدم پر اسے اندازہ ہوتا ہے کہ جو وطن، جو گاؤں، جو ارض ہند وہ خیالوں میں بسا کر چلا تھا، اس خواب اور حقیقت کے درمیان بہت فرق آ چکا ہے۔ اسی افسانے کی ایک مثال دیکھئے۔

''مگر جس وقت بمبئی میں جہاز سے اترا اور کالے کالے کوٹ پتلون پہنے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی

بولتے ملاح دیکھے۔ پھر انگریزی دکانیں، ٹراموے اور موٹر گاڑیاں نظر آئیں، پھر ربڑ والے، پہیوں اور چرٹ والے آدمیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پھر ریل کا اسٹیشن دیکھا اور ریل پر سوار ہو کر اپنے گاؤں کو چلا..... یہ کوئی اور دیس تھا۔ یہ امریکہ تھا، انگلستان تھا مگر پیارا بھارت نہیں''۔ ۱۷

اپنے گاؤں پہنچ کر بھی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ برگد کے وہ درخت جن کی شاخوں سے لٹک کر وہ جھولا لیتا تھا۔ گاؤں کا وہ مرکز جہاں چوپال لگتی تھی اور اکھاڑے میں پہلوانوں کی زور آزمائی کا دلچسپ نظارا ہوتا تھا۔ گزرتے وقت کی دھول نے سبھی منظروں کو چھپا دیا تھا۔ اب کہیں ڈاکخانہ ہے، کہیں پولیس اسٹیشن، ڈھونڈے سے بھی اسے اپنے دیس کی جھلک نظر نہیں آتی اور نہ صرف بیرونی مناظر بدلے ہیں بلکہ لوگوں کے رویے بھی بدل چکے ہیں۔ پورے گاؤں میں کوئی شخص ایسا نہیں جو ایک بوڑھے، کمزور مگر انجان مسافر کو ایک وقت کی روٹی یا ایک رات گزارنے کے لیے بچھونا دے سکے۔ یہ ہے پریم چند کے افسانوں میں بدلتا ہوا دیس۔

اسی طرح ان کے مشہور افسانے ''عیدگاہ'' میں بھی شہروں کی جھلک مل جاتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ عید جیسے اجتماع کے لیے بھی، جو تفریحی مقام موجود ہے وہ قریب ترین شہر ہی میں ہے۔ چنانچہ رونق میلہ دیکھنے کے لیے دیہاتیوں کو شہر کا رخ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ بھی شہریت کا اعجاز ہے۔ مزید براں گاؤں کے ایک سادہ لوح بچے کی نظر سے ذرا دیکھیے۔

''..... بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے۔ یہ مدرسہ ہے۔ یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھنے جاتے ہیں..... نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر''۔ ۱۸

پریم چند کے عہد میں، برصغیر پر انگریزی راج مستحکم ہو چکا تھا۔ بااختیار طبقے کی سوچ اور طرز معاشرت، غیر محسوس طریقے سے، برصغیر کے عوام میں سرایت کر چکی تھی۔ خاص طور پر جدید اور تیز رفتار زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ نئی روشنی اور نئی تعلیم اپنے ساتھ نئے اور جدید نظریات کا تحفہ لائی تھی۔ نئی نسل لکھنے پڑھنے کی طرف زیادہ مائل تھی اور اپنے بزرگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال اور بالغ نظر تھی۔ نوجوان نسل نت نئے پیشوں کی طرف متوجہ تھی اور روزگار کے تقریباً ہر شعبے میں لوگ، قسمت آزمائی کے لیے تیار تھے۔ وکیل، ڈاکٹر، کالج کے پروفیسر، کلرک غرض ایسے بے شمار کردار پریم چند کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ جن کا خاص تعلق شہری زندگی سے ہے۔ اسی نئے طرز فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بیسویں صدی کے اوائل ہی سے عورتوں کو اپنے حقوق کا نہ صرف احساس ہونے لگا بلکہ وہ یہ بھی جان گئیں کہ وہ مردوں کے اس معاشرے میں، اپنی محنت اور کاوش سے اپنے لیے قابل لحاظ جگہ بنا سکتی ہیں۔

''آج کی تہذیب، ایک نسل پہلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرین انصاف ہے۔ اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کیے جاتے۔ اب عورتوں کو مرد سے باز پرس کرنے کا حق ہے''۔ ۱۹

اسی طرح ''مس پدما'' میں ایک بہن دوسری کو سمجھاتے ہوئے کہتی ہے کہ عورتوں نے شادی کو ذریعہء معاش سمجھ لیا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں کرتیں اگر وہ چاہیں تو ابھی ان کے لیے بہت مواقع ہیں۔ وہ اپنی ذہانت، علم اور زود فہمی کی بدولت مردوں کے اس معاشرے میں اپنی برتری ثابت کر سکتی ہیں۔ ''کشمکش'' میں بھی ''شردھا'' اپنی ماں ''کوکلا'' کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کچھ ایسے ہی

خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ گویا یہ وہ زمانہ تھا جب عورتیں، اپنی انفرادی حیثیت کو نہ صرف جان چکی ہیں بلکہ اس حیثیت کو منوانے کا بیڑہ بھی اٹھا چکی ہیں۔ اس طرز فکر کا دائرہ یہیں تک محدود نہیں بلکہ معاشرتی نظام اور طرز معاشرت بھی اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک خصوصاً اور بعد ازاں عموماً مشترکہ خاندانی نظام کو مثالی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن نئی تعلیم نے اس نظام معاشرت کی بنیادیں بھی کھوکھلی کرنا شروع کر دی تھیں۔ پریم چند کو اس تبدیلی کا بخوبی احساس تھا اس کی ایک جھلک ان کے افسانے ''بڑے گھر کی بیٹی'' سے ملاحظہ فرمائیے۔

> ''خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل کی بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل جل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی تھی۔ اسے وہ ملک اور قوم کے لیے فال بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں انہیں مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض شریف زادیاں تو انہیں اپنا دشمن سمجھتیں۔''۔[۲۰]

نیا فلسفہ، نئی تعلیم نئے خیالات، اپنے ساتھ نئے سوالات بھی لاتے ہیں۔ یہ نئے سوالات، انسان کے ذہن میں تشکیک پیدا کرتے ہیں اور شک بندھے بندھائے نظریات اور اعتقادات پر ضرب لگاتا ہے۔ اگرچہ یہی شک، سوال اور جستجو، علم کی نئی منازل کی طرف بھی راہنما بنتے ہیں مگر ہر متجسس ذہن کو تعمیر سے پہلے تخریب کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ انسان کا ذہن خاص طور پر مذہبی عقائد کے لیے بہت ہٹ دھرم ہوتا ہے اور جب تشکیک کا حملہ ہو تو ایسے عقائد بھی کمزور پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پریم چند کے دور میں بھی ایسے افراد کی کمی نہ تھی جو جدید تعلیم سے متاثر ہو کر، مذہب سے باغی ہو چکے تھے۔ ''دہریہ پروفیسر'' ایسے ہی افراد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا افسانہ ہے۔

طبقاتی تفاوت، شہری زندگی کی نمایاں ترین خصوصیات میں سے ہے۔ شہروں میں حاکم وہی ہے جو با اختیار اور ثروت مند ہے اس ضمن میں پریم چند کا ایک جملہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔

> ''.....مگر اختیار کی عنان سیاست کی طرح مدنیات
> میں بھی ہمیشہ ثروت کے ہاتھ رہی ہے اور رہے گی''۔[۲۱]

اس جملے سے پریم چند کا سیاسی اور تمدنی شعور واضح ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ بھی کھلتا ہے کہ جب برصغیر میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل ڈالی گئی تو پریم چند اس کے پرجوش حامی کیوں بنے۔

طبقاتی عدم مساوات کا جب ذکر آتا ہے تو نچلے اور متوسط طبقے کی پریشانیوں کا ذکر بھی لازم ہے۔ یہ طبقہ بالائی طبقے کے آرام و آسائش کے لیے اپنے پسینے کی جگہ لہو بہاتا ہے۔ محنت یہ لوگ کرتے ہیں اور پھل با اختیار لے جاتے ہیں۔ یہی طبقاتی استحصال، بے کسی اور کمزوری کو جنم دیتا ہے۔ اس طبقے کے مسائل بھی جگہ جگہ پریم چند کی کہانیوں میں جھلکتے ہیں بلکہ شہری زندگی کے عکاس، اکثر افسانے انہی مسائل کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ کہیں دکاندار ہنرمند کے ہنر کو کم قیمت میں خرید کر، آسائش پرست امیر کو مہنگے داموں فروخت کر دیتا ہے۔ کہیں مل کا مالک اپنے مزدور کو اتنی مزدوری بھی نہیں دیتا کہ وہ پیٹ بھر روٹی کھا سکے۔ یہی طبقہ بھوک اور استحصال سے گھبرا کر کبھی جرم کا راستہ اختیار کرتا ہے (غریبی کا انعام) تو کہیں بغاوت پر اتر آتا ہے (جلوس) بیروزگاری، صرف نچلے طبقے ہی کا نہیں، اس طبقے کا بھی مسئلہ ہے جو کچھ پڑھ لکھ چکا ہے۔ ''بیوہ کا ایثار'' سے ایک مثال دیکھیے۔

''اندر جیت: ابھی کوئی مریض وریض نہیں ملا؟

میں: ابھی تو کوئی نہیں ملا اور ملے بھی کہاں سے؟ ڈھیروں ڈھیر تو ڈاکٹر ہیں۔ گلی گلی میڈیکل ہال اور دواخانے ہیں۔ علاوہ اس کے ابھی مجھے کام شروع کیے دن ہی کتنے ہوئے ہیں''۔۲۲

شہروں کی ایک اور خاصیت مادیت پرستی ہے۔ پریم چند کے عہد میں بھی جو شہر ترقی پا رہے تھے، مادیت پرستی کے عفریت نے ان کو جکڑ لیا تھا۔ دولت کا ارتکاز، افراد کے مخصوص گروہ میں تھا اور یہ گویا ایک ملکہء حسن تھی جس کے عاشق، طلب وصال میں دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے تھے اور ان کا منشا اس حسن بے نقاب کا حصول تھا جس کے لیے جائز و ناجائز کی تمیز مٹ چکی تھی۔ افراد کے اس معاشرتی رویے کو، پریم چند نے اپنے افسانے ''نمک کا داروغہ'' میں فنی مہارت گہری بصیرت اور عمیق مشاہدے کی آمیزش سے نمایاں کیا ہے۔ دو اقتباسات دیکھیے۔

''ان کے باپ..... نے کہا..... ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی آمدنی کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ پور نماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لیے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لیے اس میں برکت ہوتی ہے''۔۲۳

بنسی دھر اس بالائی آمدنی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، نمک کی چوری کو نہ صرف روکتے ہیں بلکہ سیٹھ جی کو پولیس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ عدالت دولت کی چکاچوند سے اندھی ہو کر، بنسی دھر ہی کو غلط قرار دیتی ہے اور ان کی نوکری جاتی رہتی ہے تو اس موقع پر بنسی دھر کے خاندان کا ردعمل دیکھیے۔

''بوڑھے منشی جی..... نے سر پیٹ لیا اور بولے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں۔ بہت دیر تک پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے۔ غصے میں کچھ سخت سست بھی کہا اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب نہیں تھا کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے تو کئی دن سیدھے منہ سے بات نہیں کی''۔۲۴

راتوں رات امیر بن جانے کی خواہش، پریم چند کے ایک اور افسانے ''لاٹری'' میں بھی موضوع بنی ہے۔ اس افسانے کے کردار، لاٹری کا ٹکٹ خرید لیتے ہیں اور وہ دولت جو ابھی ہاتھ بھی نہیں آئی۔ اس کی آس پاتے ہی ان کے رویے بدل جاتے ہیں۔ دوست ایک دوسرے کی نیت پر شک کرتے ہیں اور بھائی بھائی میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ بٹوارے تک نوبت آ پہنچتی ہے۔ یہ اور بات کہ افسانے کے آخر میں سبھی کے ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے اور سب رویے معمول پر آ جاتے ہیں۔

انسانی نفسیات کے ایک اور پہلو کو بھی پریم چند نے بڑی چابکدستی سے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ یہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو گفتار کے غازی ہیں۔ جن کے قول و فعل میں مناسبت نہیں۔ ایسے افسانوں میں ''انسان نما حیوان'' اور ''ماں'' بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ''انسان نما حیوان'' کا پنڈت امبکا پرشاد، مجلسی زندگی میں بہت روشن خیال ہے۔ حقوقِ نسواں اور آزادیِ نسواں کا زبردست حامی اور پرجوش داعی ہے لیکن اپنی بیوی کے لیے وہ ایک ظالم و جابر اور بے حد تنگ نظر شوہر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی اس

کا ظلم اور جبر سہتے سہتے، گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔ دوسری طرف ''ماں'' کا پرکاش ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ زبان سے وہ قوم کا سچا ہمدرد ہے لیکن قوم کے لیے کسی عملی ایثار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ سادگی اور عاجزی پر طویل تقاریر کر سکتا ہے۔ مگر اس کا خرچ ہمیشہ اس کی آمدن سے زیادہ رہتا ہے۔ اڑیسہ میں قحط کے موقع پر وہ رضا کاروں کی ایک ٹیم تیار کرتا ہے مگر خود اپنے وظیفے پر لنکا جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

دولت اپنے ساتھ آسائش اور پرتکلف زندگی کے لوازمات لاتی ہے۔ پریم چند نے جہاں بالائی طبقے کی خودغرضی اور بے حسی کو اپنے افسانوں میں ظاہر کیا ہے۔ وہیں ان کی شان و شوکت کی جھلکیاں بھی اپنے قارئین کے لیے پیش کی ہیں۔ تاجر، سیٹھ اور خصوصاً پارسی دھنوان ان کے افسانوں کے کردار ہیں ایک اقتباس دیکھیے۔

> اس کے سامنے چند پارسی لیڈیاں اور دیگر لوگ ٹہل رہے تھے..... یہ لوگ جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں..... انواع اقسام کے مزیدار کھانے کھائے، ریشم اور مخمل سے تن ڈھانپے..... گاڑیوں میں ہوا خوری کرنے نکلیں.....'' ۲۵

اس دور کا ایک اہم رجحان دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت کا تھا۔ لوگ، شہروں کو اپنی پریشانیوں کا حل سمجھتے تھے، غربت، تنگدستی اور کم آمدنی سے گھبرائے ہوئے اور فاقوں سے اکتائے ہوئے لوگ شہروں کی نمود و نمائش سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے اور اپنا گھر بار چھوڑ کر شہروں کی طرف نقل مکانی کرتے تھے۔ پریم چند کے ہاں اس عمومی معاشرتی رویے کا بھی واضح عکس ملتا ہے۔

پریم چند کے علاوہ اس دور کے دوسرے اہم افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے نام نمایاں ہیں۔ پریم چند کا رجحان سماجی حقیقت نگاری کی طرف تھا اور انہوں نے اپنے افسانوں میں ارضی مسائل کی طرف رجوع کیا تھا۔ ان کے برعکس سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کا مزاج رومانی تھا بلکہ وہ رومانی تحریک کے اولین علمبرداروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی فضا طلسماتی اور پراسرار ہے اور ان کے موضوعات انسان کو فطرت سے قریب تر کرنے کی کاوش ہیں۔ ان کے ہاں ہر منظر ایک تحیر آمیز دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ جذبات کا وفور، انسان کو عقل و ہوش سے بیگانہ کر دیتا ہے اور وہ دیوانہ وار اپنے جذبات کی پکار پر لبیک کہہ دیتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے ڈانڈے قدیم اساطیری قصوں سے جا ملتے ہیں۔

ان کے افسانوں کو بدلتی ہوئی صورتحال یا فوری مسائل سے کچھ خاص علاقہ نہیں۔ اسی لیے گاؤں یا شہر کی زندگی یا بدلتے ہوئے سماجی شعور کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں جستہ جستہ ہی نظر آتی ہیں بلکہ ایسے افسانوں کی تعداد انگلیوں پر شمار کی جا سکتی ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا خاص موضوع عورت اور مرد کا باہمی رشتہ ہے اور اس رشتے کی نزاکتوں اور لطافتوں کے بیان کے لیے کبھی وہ دس ہزار برس پرانے جزیروں (خارستان و گلستان) کی سیر کرتے ہیں تو کبھی زمانہ حال کی عورت (نکاح ثانی) کی داستان مہر و صفا کا بیان کرتے ہیں۔ سید معین الرحمٰن کا کہنا ہے۔

> ''یہ صحیح ہے کہ مجموعی طور پر یلدرم کے ہاں رومانیت کا رجحان غالب ہے اور یہ رومانیت جہاں تہاں ارضی حقیقتوں کا ساتھ نہیں دیتی لیکن انہوں نے زندگی کے پس منظر کو خود تعمیر کیا ہے..... وہ بالعموم حقیقت کو فراموش نہیں کرتے۔ ان کے افسانے رومانیت اور حقیقت کا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں۔'' ۲۶

سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں ہندوستان کے شہروں کی بدلتی ہوئی زندگی براہ راست نظر نہیں آتی۔لیکن نئی روشنی کی بدولت طبقہ نسواں کی سوچ میں جو تبدیلی آرہی تھی اس کی جھلک یلدرم کے افسانوں میں موجود ہے۔مثلاً ''صحبت ناجنس'' کی عذرا ایک ایسی لڑکی ہے جو طبقہ امرا میں سے ہے۔خاندانی شرافت اور ثروت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے اس لیے ہندوستانی راگ، گویوں یا زبان سے نابلد ہے۔اس کے مقابلے میں انگریزی گانے گانے اور پیانو بجانے کے فن سے آشنا ہے۔وہ اپنی بے میل شادی کا ذکر اپنی پیاری دوست سلمیٰ سے کرتی ہے تو سلمیٰ اسے جوابی خط میں اپنے دکھ سے روشناس کراتی ہے۔افسانے کے باقی پہلوؤں سے قطع نظر چند سطریں دیکھیے۔جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل کی عورت نہ صرف تعلیم یافتہ اور اپنے حقوق سے آشنا ہے بلکہ ایک زندہ انسان، ایک فعال فرد کی طرح اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لیے بھی کوشاں ہے۔

> ''.....پھر اصلاح ہوئی، کفو کا خیال ترک کر دیا گیا۔تعلیم کا زور ہوا۔ بر تعلیم یافتہ ہونا چاہئے .....شاید میں نے پڑھا لکھا نہ ہوتا تو یہ خیالات میرے ذہن میں نہ آتے، شاید میری نظر سطحی ہوتی اور اس لیے میں زیادہ متحمل، زیادہ صابر ہوتی..... میرے ذہن میں نہ آتا کہ حقارت کا مقابلہ حقارت سے کیا جا سکتا ہے۔شاید میں یہ بھی نہ سمجھتی کہ میری حقارت کی جا رہی ہے''۔۲۷

اسی طرح ''حکایہ لیلیٰ و مجنوں'' میں نئے زمانے کے قیس کے لیے نئی قسم کی مشکلات کا ذکر ہے۔

> ''.....قدرت نے..... بیچارے قیس عامر کو پھر نجد میں لا بٹھایا تھا.....اس نجد میں نہیں جو قیس..... کے زمانے سے لے کر ۱۹۰۷ء تک تھا..... بلکہ اس نجد میں جس میں اب ریل تھی، ٹراموے تھی۔ ترقیاں تھیں، مصیبتیں تھیں.....''۔۲۸

اسی طرح یلدرم کا افسانہ ''ازدواج محبت'' روایتی شادی سے ہٹ کر محبت کی شادی کے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار ایک ایسی لڑکی سے پسند کی شادی کرتا ہے جو پڑھی لکھی ہے اور خود مختار ہے اور مردوں کے معاشرے میں کسی سہارے کے بغیر زندگی گزار رہی ہے۔اس افسانے میں روایتی پردے سے بیزاری کا اظہار بھی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ نوجوان نسل کی خواتین اب مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہونا چاہتی ہیں۔یلدرم کی ایک اور تحریر ''اگر میں صحرانشیں ہوتا'' تمام کی تمام طبقاتی نظام، جنس کی لحاتی تسکین، امیر کی بے حسی اور غریب کی بے کسی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔یوں یہ کہنا بجا ہے کہ یلدرم کے ہاں بھی کہیں کہیں شہر اور شہر کے مخصوص پہلوؤں میں سے چند ایک کا ذکر مل جاتا ہے۔البتہ نیاز فتح پوری کے افسانے خالصتاً رومانی مزاج کے حامل ہیں۔نیاز فتح پوری، شہریوں کا ذکر کرتے ہوئے صرف ساحلوں پر سیر و تفریح کی خاطر آنے والی پارسی دوشیزاؤں کے مہکتے آنچلوں، چمکتے چہروں اور روشن آنکھوں کے بیان تک محدود رہتے ہیں۔البتہ ایک افسانے ''چند دن بمبئی میں'' میں وہ عوام الناس کے اس ذہنی رویے کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جس کے مطابق عام لوگ، شہروں کو دولت کمانے کا مرکز سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں ہر شخص جو کسی بڑے شہر کی طرف عازم سفر ہے گویا ایک نئے جہان خواب کی اور جا رہا ہے جہاں اس کی جیب سکوں سے بھری اور دل طمانیت اور خوشی سے لبریز ہوگا۔

> ''.....ایک ہی گاڑی میں سفر کرنے والے اظہار تفوق کا یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں اور پھر تماشہ یہ کہ جہاں کسی نے ''کلکتہ یا بمبئی'' یا کسی دوسرے دولت مند شہر کا نام لے دیا تو قریب جانے والے

غریب کچھ ایسے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ خواہ مخواہ اس کے اندر شان امارت محسوس کرنے لگتے ہیں اور
اپنی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ ظاہر کرنے لگتے ہیں کہ ''یہ شخص کیسا خوش قسمت ہے''۔۲۹

درحقیقت یہ دور اردو افسانے کا عہد طفولیت تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ رومانیت نے نوجوان پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں پر اپنا تسلط جما رکھا تھا۔ دوسری طرف علی گڑھ تحریک کی مقصدیت کے خلاف ردعمل نے بھی اپنا رنگ خوب دکھایا۔ البتہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی بالعموم اور تیسری دہائی سے بالخصوص شاعروں اور نثر نگاروں کے سوچنے اور بیان کرنے کے انداز خاصی حد تک بدلنے لگے۔ حقیقت نگاری کے جوش نے لکھنے والوں کی نوک قلم کو لہو میں ڈوبنا سکھایا اور افسانے میں بھی گرد و پیش ہی کی زندگی کو موضوع بنانے کے عمل کا آغاز ہوا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے انجام تک، دنیا جن تیز رفتار تبدیلیوں سے دوچار ہوئی۔ جنوبی ایشیا بھی ان سے اثر پذیر ہوا۔

بیسویں صدی ایک ہنگامہ خیز صدی تھی۔ اس صدی کے دوران میں دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا۔ عالمی سطح پر دو عظیم جنگیں لڑی گئیں۔ جنگ عظیم اول ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور جنگ عظیم دوم ۱۹۳۹ء میں۔ ان دونوں جنگوں نے کئی ممالک کو اپنی لپیٹ میں لیا اور لاکھوں افراد ان سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس بھی ایک بہت اہم واقعہ تھا۔ یہ اور ان جیسے دوسرے واقعات کا پوری دنیا کے ممالک پر سیاسی، معاشی اور سماجی لحاظ سے گہرا اثر ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک برصغیر تاج برطانیہ کے زیر نگیں تھا اور جنگ عظیم اول و دوم میں برطانیہ نے براہ راست حصہ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کے عوام بھی گویا ان دونوں جنگوں کے براہ راست فریق بن گئے۔ برطانوی افواج میں ہندوستانی فوجی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ یوں ان جنگوں کے اثرات، ہندوستان کے پسماندہ ترین علاقوں تک محسوس کیے جاتے رہے۔ دوسری طرف یہ صدی تعلیمی انقلابات کی بھی صدی تھی۔ صدیوں پرانے تصوراتِ انسانی پر ضرب پڑنے لگی تھی اور لوگ خاص طور پر نوجوان طبقہ، اپنے ذہنی اور علمی افق کو وسیع تر کرنے کا خواہش مند نظر آتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب برصغیر کے باشندوں میں بھی سیاسی اور علمی بیداری کی مضبوط لہر دوڑتی نظر آ رہی تھی۔ یہاں کا نوجوان، اپنے محلے یا اپنے شہر سے آگے، اپنے ملک کی سرحدوں کے پار بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ زندگی کا براہ راست مشاہدہ بلکہ تجربہ کرنے کی کوشش کرتا تھا اور نئی تعلیم، نئے خیالات، نئی سوچ اور نئی روشنی کی کرنوں سے نہ صرف اپنے دل و دماغ کو منور کرنا پسند کرتا تھا بلکہ اس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے نئے مشاہدات کو عملی زندگی میں برت کر بھی دکھائے۔ منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور ان کے معاصرین کے بعد افسانہ نگاروں کے جو نمائندے ابھر کر سامنے آئے ان میں یہ خواہش، پوری شدت کے ساتھ موجزن نظر آتی ہے۔

افسانہ نگاروں کی اس نئی نسل نے اپنے شعور اور بغاوت کا اعلان ''انگارے'' کی اشاعت سے کیا۔ چار نوجوان، روشن دماغ اور نئی تعلیم و سوچ سے بہرہ ور مصنفین نے اپنے افسانوں کے لیے نئے موضوعات چنے اور چونکہ افسانے کے پرانے سانچے بدلتی ہوئی سماجی زندگی کا کماحقہ، احاطہ کرنے سے قدرے قاصر تھے اس لیے تکنیک کا تنوع اور نئی نئی تکنیکوں کا اختیار کرنا بھی ضروری سمجھا گیا۔ جنوبی ہند کے بیشتر شہر، غیر متوقع اور تیز رفتار تبدیلیوں سے گزر رہے تھے۔ یہاں کے باشندوں کی سماجی زندگی پہلے سے بہت حد تک مختلف ہو چکی تھی۔ پرانے تصورات اور نظریات پر ضرب پڑ رہی تھی اور نوجوان خاص طور پر نئے نظریات سے متاثر بھی ہو رہے تھے اور انہیں قبول کر کے عملی زندگی میں برتنے کے لیے تیار بھی۔ وہ دنیا کو اپنی نظر سے دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔ انگارے میں یہ خواہش کھل کر تشکیل پاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں انگارے کی اشاعت اس قدر دھماکہ خیز تھی کہ سماج کے لیے اس کی گونج کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور اس کتاب کو ضبط کر لیا گیا۔ حالانکہ آج انگارے کی حیثیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہو چکی ہے۔ انگارے کے مصنفین میں احمد علی، سجاد ظہیر، رشید جہاں اور محمود الظفر شامل

ہیں۔ان افسانوں کے دوسرے ادبی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ،ان میں جنوبی ہند کے بدلتے ہوئے شہری ماحول کی جھلکیاں بھی جستہ جستہ مل جاتی ہیں۔مثلاً سجاد ظہیر کا افسانہ ''نیند نہیں آتی'' جو آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک میں لکھا گیا۔اس میں شہروں کے ہسپتال اور یہاں کے ڈاکٹروں کا رویہ ایک جملے میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

''خیراتی ہسپتال،نرسیں،ڈاکٹر،سب ناک بھوں چڑھائے''۔۳۰

جنس کا بدلتا ہوا تصور بھی یہاں جاگزیں ہے، یہاں طوائف پریم چند کی طوائف سے مختلف ہے کہ جس کے اندر کی عورت کسی حال میں نہیں بدلتی یہاں اگر عورت اپنے جسم کا کاروبار کرتی ہے تو اس کے بدلے میں پوری قیمت بھی چاہتی ہے۔یہ الگ امر ہے کہ وہ قیمت اسے ملے یا نہ ملے۔

''.....روپئے کی غلام۔سمجھتی ہے میرے پاس ٹکے نہیں،روپئے دیکھ کر راضی ہوگئی.....''۳۱

طبقاتی امتیازات،شہریت کا خاصہ ہیں۔عبوری یا تشکیلی دور کے ان افسانہ نگاروں کو شعوری وسعت کی بنا پر یہ امتیازات زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوئے اور انہوں نے نچلے طبقے کے درد اور بالائی طبقے کی بے حسی کو پورے طور پر بیان کرنے کی کوشش کی۔اس ضمن میں سجاد ظہیر کا افسانہ ''گرمیوں کی ایک رات'' قابل ذکر ہے۔

رشید جہاں کا افسانہ ''دلی کی سیر'' دلی شہر کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔ملکہ بیگم،اپنے ملنے والیوں میں پہلی خاتون ہیں جو ریل میں بیٹھ کر دلی شہر کی سیر کے لیے گئیں۔ہر چند کہ ان کا یہ تجربہ ریل کے ڈبے میں سفر کرنے اور بعد ازاں سٹیشن پر بیٹھے رہنے ہی تک محدود تھا لیکن اتنا سا تجربہ بھی دوسروں کے لیے ایک زمانے کی سیر سے کم نہ تھا۔ان کی داستان کے بیان میں جگہ جگہ دلی شہر کی بدلتی ہوئی معاشرت دکھائی دیتی ہے۔اسٹیشن اور ریل کی پٹڑی، دھواں دیتے کالے انجن، ریلوے ملازمین، قلی، مسافر جن میں زیادہ تعداد انگریز صاحبوں اور میم صاحبوں کی تھی۔خوانچہ فروش،ہجوم،اسٹیشن کے شہدے یعنی شہری معاشرت کی چھوٹی چھوٹی تصویروں سے اس سفر کی روداد مکمل ہوتی ہے۔ نئی تعلیم اور نئے مشاہدات نے فرد کو اپنی انفرادیت سے روشناس کرایا تھا اور سماج کے پسے ہوئے اور مظلوم طبقے میں بھی خود شناسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔عورت جو اس سے پہلے چراغِ خانہ تھی یا شمعِ محفل اور ہر دو صورت میں اس کی اپنی ذات کی کوئی پہچان نہ تھی۔اب بحیثیت انسان، الگ وجود رکھتی تھی اور اسے خود اس امر کا احساس بھی تھا۔اس نئی عورت کے جذبات و احساسات کا بہت خوبصورت بیان رشید جہاں کے ڈرامے ''پردے کے پیچھے'' میں کیا گیا ہے۔انگارے گروپ کے مصنفین نے سماج، ادب اور روایت کے پرانے تصورات کو ملیا میٹ کر کے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی کاوش کی اور یہ اس قدر پر تاثر کتاب رہی کہ اس نے کئی دہائیوں تک کسی نہ کسی طرح اردو ادب کو متاثر کیا۔یہاں تک کہ اسے اردو ادب کی ایک بہت اہم تحریک، ترقی پسند تحریک کے آغاز کے اسباب میں ایک سبب کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔بہر حال ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ آغاز تک اردو افسانے میں عصری شعور کی جھلک بہت نمایاں ہوگئی اور اس وقت کے جنوبی ایشیا کے سیاسی،نفسیاتی اور سماجی شعور کو سمجھنے کے لیے ان افسانوں کا تجزیہ بہت اہم ہے۔

حواشی وحوالہ جات

1- Hamza Alvi: "Formation of the Social Structure of South Asia under the Impact of Colonialism" Published in "Sociology of Developing Societies" edited by Hamza Alvi and John Harris, Macmillan, page 5

2- Hamza Alvi: Ibid, page 11

۳۔ شمیم حنفی: ''رات، شہر اور زندگی'' دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۸، ص ۲۳۔۲۲

۴۔ شمیم حنفی: ایضاً، ص ۲۵

۵۔ شمیم حنفی: ایضاً، ص ۳۱۔۲۲

۶۔ شمیم حنفی: ایضاً، ص ۱۹

7- Suketu Mehta: "Maximum City, Bombay Lost & Found" London, Headline Brok Publishing, 2004. Pg,14

8- Suketu Mehta: "Maximum City Pg13

9- Naryani Gupta: "Dehli (Between two Empires 1803-1931", Second edition: Oxford University Press, 1999, pg3

10- Naryani Gupta: "Dehli (Between two Empires 1803-1931)", Pg.4

11- Naryani Gupta: "Dehli (Between two Empires 1803-1931)", pg5

12- Navyani Gupta: "Dehli (Between two Empires 1803-1931)", pg13

13- Ian Talbot: "Divided Cities (Partition and its Aftermath in Lahore and Amritsar 1947-957", Oxford University Press, 2006, Pg. 2-3

14- Ian Talbot: "Divided Cities" Pg. 4-7

15- Ian Talbot: "Divided Cities" Pg. 8

۱۶۔ قرۃ العین حیدر: دیباچہ ''اختر النساء بیگم''، مصنفہ، نذر سجاد حیدر، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۴ء، ص ۲۷

۱۷۔ پریم چند: ''مجموعہ منشی پریم چند (افسانے)'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۲، ص ۲۴

۱۸۔ پریم چند: ''مجموعہ منشی پریم چند''، ص ۷۷۸

۱۹۔ پریم چند: ''لعنت'' مشمولہ ''مجموعہ منشی پریم چند'' ص ۷۰۳

۲۰۔ پریم چند: ''بڑے گھر کی بیٹی'' مشمولہ ''مجموعہ منشی پریم چند، ص ۱۸

۲۱۔ پریم چند ''لعنت'' مشمولہ ایضاً، ص ۲۰۳

۲۲۔ پریم چند: ''بیوہ کا ایثار'' مشمولہ ایضاً، ص ۲۸

۲۳۔ پریم چند: ''نمک کا داروغہ'' مشمولہ ایضاً، ص ۱۲۳

۲۴۔ پریم چند: ایضاً، ص ۱۲۷

۲۵۔ پریم چند: ''غریبی کا انعام'' مشمولہ ایضاً، ص ۲۱۹

۲۶۔ یلدرم، سجاد حیدر: ''خیالستان''، لاہور، تاج بکڈپو، ۱۹۸۴ء، ص ۲۶

۲۷۔ یلدرم، سجاد حیدر: ایضاً، ص ۵۸، ۵۷، ۵۴

۲۸۔ یلدرم، سجاد حیدر: ایضاً، ص ۱۶۴۔۱۶۳

۲۹۔ نیاز فتح پوری: ''چند دن بمبئی میں'' مشمولہ ''نگارستان''، طبع سوم، لکھنؤ نسیم بکڈپو، اپریل ۱۹۸۳ء، ص ۲۳

۳۰۔ احمد علی و دیگر: ''انگارے'' (مرتبہ: خالد علوی، ڈاکٹر) دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۵، ص ۱۰۸

۳۱۔ احمد علی و دیگر: ''انگارے''، ص ۱۱۰